حکیم ابوالقاسم فردوسی طوسی

جناب آفتاب اختر صاحب ریسرچ اسکالر آف دی یو جی سی (حکومت ہند)
شعبۂ فارسی و اُردو دانش گاہ لکھنؤ

فردوسی ہوں یا حافظ، سعدی ہوں یا خیام، ہمارے یہاں ایسے باکمال شعراء کے حالات فراہم کرنے کے لئے کافی دردِ سر اٹھانا پڑتا ہے۔ تب کہیں تھوڑے بہت حالات حاصل ہو پاتے ہیں۔ دراصل ہم لوگوں میں کسی شاعر کے حالات کو باقاعدہ محفوظ رکھنے کا رواج ہی نہیں رہا ہے، اگر شاعر کی وفات کے بعد کسی نے اُس کے شخصی و نجی حالات پر کچھ لکھا بھی تو زیادہ تر سنی سنائی باتوں ہی کو اپنا ماخذ بنایا اور کبھی کبھی کاوی سے کام نہیں لیا۔ اگر اس کے بغیر وہ کافی حالات کا ذخیرہ ہی چھوڑ جاتے تب بھی غنیمت تھا۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ہمیں ایسے باکمال شعراء کے بارے میں لکھنے کے لئے سیکڑوں تذکروں کا جائزہ لینے کے بعد بھی معتبر مواد زیادہ نہیں ملتا۔ اس لئے مجبوراً ہم لوگوں کو بھی اُن کے حالات وغیرہ کو ترتیب دیتے وقت انھیں تذکروں، افسانوں اور حکایتوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جن کا تحقیقی معیار بلند نہیں ہے۔

انہی پریشانیوں کا سامنا فردوسی کے حالات کو ترتیب دیتے وقت بھی ہوتا ہے، کیوں کہ کوئی ایسا تذکرہ نہیں ملتا جو اس کے عہد کا ہو یا اگر عہد کا نہ بھی ہو تو قریب العہد تو ہونا ہی چاہیے۔ جس میں اس کے حالات وافر تعداد میں یکجا کر دیئے گئے ہوں۔

بس نظامی عروضی سمرقندی کا "چہار مقالہ" ہی ایسا نظر آتا ہے جس میں فاضل مصنف نے اس کے حالات کو ذرا تفصیل سے تحریر کر دیا ہے، نظامی عروضی سمرقندی، فردوسی کی وفات کے تقریباً سو سال بعد عالم وجود میں

آیا تھا۔ اس لئے یہی فردوسی سے زیادہ قریب العہد معلوم ہوتا ہے، اُس نے اپنے بزرگوں سے فردوسی کے بارہ میں جو کچھ سنا تھا وہی اس میں تحریر کر دیا ہے۔ موجودہ محققین کے لئے یہی زیادہ مستند مواد سمجھا جا سکتا ہے، کیوں کہ اس کا امکان ہے کہ عروضی تک زندہ رہنے والے بعض بزرگوں نے شاید فردوسی کو اس کے آخری ایام میں دیکھا بھی ہو، یا اُن کے کسی بعض قریبی بزرگوں نے اُن تک فردوسی کے صحیح حالات پہنچائے ہوں، بہرحال اسے تو مانا ہی جا سکتا ہے کہ عروضی تک پہنچنے والی داستانوں، حکایتوں اور اطلاعوں میں سچ کا عنصر زیادہ رہا ہوگا۔ اس کی تائید فروغی کے مندرجۂ ذیل خیال سے بھی ہوتی ہے :-

"تنہا ماخذے کہ برائے احوالِ فردوسی بغیر از گفتۂ خود می تواں محل اعتنا قرار داد کتاب چہار مقالۂ نظامی عروضی سمرقندی است کہ کمتر از صد و پنجاہ سال بعد از شاہنامہ نگاشتہ شدہ و نگارندہ اش کمتر از صد سال پس از وفاتِ فردوسی بدنیا آمدہ است" [1]

لیکن ہمیں "چہار مقالہ" سے بھی فردوسی کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات فراہم نہیں ہوتیں سوائے اس کے کہ اس کے دیہات کا نام کیا تھا۔ اس کا مذہب کیا تھا۔ شاہنامہ کی وجہِ تخلیق کیا تھی۔ اسے اس کی تصنیف میں کتنا عرصہ لگا تھا۔ محمود کے دربار میں اُسے رسائی کیسے حاصل ہوئی تھی۔ اس کی ناکامی کی وجہ کیا تھی، وہ چہار سُو آوارہ و سرگرداں رہنے پر مجبور کیوں ہوا تھا۔ اس نے بادشاہ کے بھیجے ہوئے بیس ہزار درموں کو کھڑے کھڑے حمامی و فقاعی کو کیوں بانٹ دیا تھا اور محمود کے دربار سے فرار ہونے کے بعد اسمٰعیل وراق کے یہاں پناہ گیر ہوا تھا۔ طبرستان میں سپہبد شہریار کے دربار میں کیا گیا تھا۔ محمود کی ہجو بھی لکھی تھی۔ جسے شہریار نے خرید لیا تھا۔ بادشاہ نے جب اپنی غلطی کا احساس کرنے کے بعد اس کے پاس ساٹھ ہزار اشرفیاں بھیجیں تو ایک دروازے سے اشرفیوں سے لدے ہوئے اونٹ داخل ہو رہے تھے تو دوسری طرف دروازہ رودبار سے فردوسی کا جنازہ باہر آ رہا تھا۔ بادشاہ کے بھیجے ہوئے انعام کو اُس کی اکلوتی لڑکی نے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جس سے بعد میں ایک کاروان سرائے اور ایک کنواں نیشاپور اور طوس کے راستے میں بنوایا گیا تھا۔

"چہار مقالہ" سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی متعصب واعظ نے اس کے جنازے کو قبرستان میں دفن کی اجازت

---

[1] انتخاب شاہنامہ - مرتبہ فروغی - باہتمام وزارت فرہنگ ایران - از مقدمۂ مرتب ص ۶ -

اس لئے نہیں دی تھی کہ وہ رافضی تھا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خود عروضی نے ۵۱۰ھ میں فردوسی کی قبر کی زیارت کی تھی۔

لیکن فردوسی جیسے عظیم شاعر کے حالات مرتب کرنے کے لئے مندرجۂ بالا معلومات قطعاً ناکافی ہیں، کیوں کہ ان سے اس کی شخصی زندگی، نجی حالات اور خاندانی معلومات بالخصوص اس کے عادات واطوار اور خیالات کے بارے میں کچھ زیادہ علم نہیں ہوتا ہے۔

"چہار مقالہ" کے برخلاف شاہنامہ کے دیباچۂ بایسنغری اور شعرائے ایران کے دوسرے تذکروں میں بہت زیادہ معلومات بھری ہوئی ہیں۔ جن سے دفتر کے دفتر سیاہ کئے جاسکتے ہیں، لیکن تاریخی معیار پر وہ پوری نہیں اُترتیں۔ فروغی نے شاہنامہ بایسنغری کے دیباچہ میں مندرج حالات کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

"آن حکایات در دیباچۂ کہ در زمان بایسنغر برائے شاہنامہ نگاشتہ شدہ و منضم بچاپہائے قدیم آن کتاب است درج شدہ بعضی از قصہ ہا در کتابہائے تاریخ و تذکرۃ الشعرا منقول است امّا ہیچ یک اعتماد نمی تواں کرد۔" [1]

اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فروغی نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"چوں آں جملہ چند سال بعد از فردوسی نوشتہ و آثار بے حقیقت بودن آنہا نمایاں است" [2]

ان دشواریوں کے علاوہ یہ بھی ایک پریشانی ہے کہ فردوسی پر فراہم ہونے والے مواد میں کوئی نئی بات نظر نہیں آتی، ایک ہی طرح کے واقعات کو مختلف لوگوں نے صرف اپنے اپنے انداز میں تحریر کر دیا ہے۔ اس لئے ایک صاحب رائے محقق کا اس سلسلہ میں یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اس تمام مواد کو عقل و خرد کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد ہی اپنی تحقیق میں کوئی مقام دے۔ تاکہ مستقبل میں محققین کو کسی مزید پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

بہرحال انھیں تمام دشوار گذار مرحلوں سے گذرنے کے بعد اور تمام ممکن تذکروں اور تاریخی کتب سے استفادہ کرنے کے بعد ذیل میں اُس کی سوانح حیات کا کسی قدر تفصیلی خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

جہاں تک فردوسی کے نام کا تعلق ہے اس میں بے حد اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ اوّل تو بیشتر تذکرہ نویس اس بارے میں خاموش ہی ہیں لیکن جن لوگوں نے اِدھر توجہ کی بھی ہے تو وہ مختلف ناموں کی طرف رہنمائی کرکے

---

[1] انتخاب شاہنامہ۔ مرتبۂ فروغی۔ از مقدمہ ص ۔ [2] ایضاً۔

خاموش ہو جاتے ہیں اور اس طرح اختلافات کا ایک نیا باب کھل جاتا ہے۔ بعض اشخاص نے اس کا نام "حسن" بتایا ہے بعض نے "احمد" اور بعض نے "منصور" کے نام سے یاد کیا ہے۔ غرضکہ جتنے منھ اتنی باتیں کوئی بات یقینی نہیں کہی جا سکتی۔

آزاد ہمدانی نے "سرگذشت حکیم ابوالقاسم فردوسی"[1] میں پہلے اُسے "فردوسی طوسی حسن بن اسحاق بن شرفشاہ" بتایا ہے اور بریکٹ میں "منصور بن فخرالدین احمد بن فرخ" بھی لکھا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے: ابھی موجودہ ایرانی محققوں کے ذہن تک میں یہ بات واضح نہیں ہو پائی ہے۔ بلکہ تا ایں دم اُن کے ذہن شکوک کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں۔

بہرحال یوں تو اس کا نام جاننے کی کوئی خاص ضرورت اس لئے بھی نہیں ہے کہ وہ اپنی کنیت[2] اور تخلص[3] سے ہی کافی مشہور ہے اور لوگ اس کے نام کی طرف دھیان دینے کی ضرورت محسوس ہی نہیں کرتے اور ابوالقاسم ہی کو اس کا نام سمجھے ہوئے ہیں۔

عجیب اتفاق ہے کہ جتنے اختلافات اس کے نام کے بارے میں موجود ہیں اسی قدر اس کے والد کے نام کے بارے میں بھی پائے جاتے ہیں۔ تمام اختلافات کو ملحوظ رکھتے ہوئے تین نام "علی" "اسحاق" اور "احمد" سامنے آتے ہیں، ان واضح اختلافات کی موجودگی میں کوئی دو ٹوک رائے نہیں دی جا سکتی، البتہ یہ ضرور ہے کہ تذکروں کی اکثریت نے "اسحاق" ہی پر زور دیا ہے۔

چوں کہ فردوسی کا باپ "اسحاق" خراسان کے محترم دہاقین[4] میں سے تھا اس لئے "دہقانیت" اسے باپ سے ورثہ میں ملی تھی۔ اس کا شمار طوس کے محترم دہقانوں میں ہوا کرتا تھا۔ تیسری چوتھی صدی ہجری کے درمیان

---

[1] عشق و ادب یا سرگذشت حکیم ابوالقاسم فردوسی طوسی۔ آزاد ہمدانی کی لکھی ہوئی کتاب ہے۔ یہ مہر ماہ ۱۳۱۳ شمسی کو تہران میں شائع ہوئی تھی۔ [2] فردوسی کی کنیت کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ وہ ابوالقاسم تھی۔ [3] اور تخلص فردوسی تھا۔

[4] دہاقین جمع ہے دہقان کی اور دہقان سے یہ مراد ہے کہ "ہر قریہ دہقان مخصوصی داشت وگاہے یک دہقان برچند قریہ حکومت می کرد و دریں صورت اورا دہقان بزرگ می گفتند۔ دہقانان درہمہ جا سلامت مزاج و نیرومئ بدن و نشاط روح و پیش آمدن سینہ امتیاز داشتند" (عشق و ادب۔ مصنفہ آزاد ہمدانی ص۱)

باژ نام کے ایک قریہ کا انتظام اُسی کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے علاوہ شاداب کا قریہ جسے شاداب شہ بھی کہا جاتا ہے، اور دوسرے چند قریوں سے بھی اس کا تعلق تھا۔ صاحبِ چہار مقالہ نے فردوسی پر اپنے مقالہ کا آغاز ہی اسی طرح کیا ہے کہ "ابوالقاسم فردوسی از دہاقینِ طوس بود، از دیہی کہ آن دیہہ را باژ خوانند"[1]

فردوسی اپنے وطن کے بارے میں سب سے زیادہ خوش قسمت واقع ہوا تھا کیوں کہ اس سلسلہ میں کوئی اختلاف موجود نہیں ہے۔ تمام تذکرہ نویس متفق ہیں کہ اس کا وطن طوس ہی تھا۔ لوگ اکثر "طوسی" کہہ کر ہی فردوسی مراد لے لیتے ہیں۔

فردوسی مجوسی النسل تھا اور اس کی رگوں میں خالص ایرانی خون موجزن تھا۔ اس کے دل میں اپنی اصل کی طرف بڑی کشش موجود تھی۔ اسے اپنے شاندار ماضی سے بے پناہ محبت تھی۔ اس کے دل میں اپنی نسل و قوم کو ماضی کی عظمت و شکوہ اور جاہ و جلال میں دیکھنے کی خواہش تھی۔ اپنے اوپر اغیار کی سختیوں کو دیکھ کر اس کے دل میں اُنکے خلاف نفرت کی آگ مشتعل تھی۔ اس کا ثبوت ہمیں جگہ جگہ شاہنامہ میں ملتا ہے۔ دراصل اس کی نظروں میں عربوں کی "اسلامیت" کی تو قدر تھی لیکن اُن کی "عربیت" یعنی "عرب قومیت" اس کی نگاہ میں محترم نہیں تھی، کیوں کہ اس کی نگاہ میں خود اپنی ایرانیت کی بڑی عزت تھی۔ وہ عربوں کو ایرانیوں کے مقابلہ میں زیادہ تہذیب یافتہ نہیں سمجھتا تھا۔ اُسے یہ بھی احساس تھا کہ ان عربوں نے اپنے حملوں سے ایرانی تہذیب و تمدن کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی تھی اور انھوں نے اپنے کلچر کو ایرانیوں پر زبردستی مسلّط کر دیا ہے، اسی لئے اس کے دل میں اُن کے خلاف نفرت کے جذبات موجود تھے۔

اس کی کٹر قوم پرستی ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ اس نے عربوں کی مذمت کی ہے، وہ جو کچھ کہتا ہے صرف اپنی قومی حمیت کی برتری کے لئے۔ چوں کہ شاہنامہ سرتاپا قومی پاسداری کے رنگ میں ڈوبا ہے اس لئے وہ جہاں جہاں عربوں کا ذکر کرتا ہے اس کے طنز میں نشتریت آجاتی ہے۔ فردوسی کی عرب دشمنی کے ثبوت میں خاص طور سے مندرجۂ ذیل شعر پیش کئے جاتے ہیں اور اُن کی بنا پر اُسے "اسلامیت" سے منحرف سمجھ لیا گیا ہے۔ شعر ملاحظہ ہوں:

زشیرِ شُتر خوردن و سُوسمار ؛ عرب را بجائے رسید ست کار
کہ ملکِ کیاں را کنند آرزو ؛ تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

[1] چہار مقالہ۔ مصنفہ نظامی عروضی سمرقندی (مقالۂ دوم) ص ۶۰

ان اشعار میں بیشک فردوسی نے عربوں پر بہت سخت طنز کیا ہے۔ لیکن قابلِ غور امر یہ ہے کہ فردوسی نے انھیں کس کی زبان سے ادا کرایا ہے۔ اور کس کردار کے جذبات کی اور کس موقع پر ترجمانی کی ہے۔ نواب نصیر حسین خیال کے مطابق یہ اشعار رستم دوم نے ایک عرب کو جس کا نام سعد بن ابی وقاص تھا اس وقت بھیجے تھے جب اُس نے اُسے اسلام قبول کرنے کا مشورہ دیا تھا۔[1] اور یہ شرط رکھی تھی کہ اگر حکم عدولی ہوئی تو انجام بد ہوگا۔ اب قابلِ غور امر یہ ہے کہ ایسی حالت میں کیا ایک ایرانی حکمراں کو اتنا سخت جواب نہیں دینا چاہیئے تھا؟ میرا تو خیال ہے اگر فردوسی اپنے اس کردار کی زبان سے اس سے بھی زیادہ سخت الفاظ ادا کرواتا تو موقع کی مناسبت سے موزوں ہی ہوتا۔ دراصل وہ اس وقت ایک ایرانی النسل حکمراں کے کردار کے جذبات کی عکاسی کر رہا تھا اگر وہ اس کی زبان سے ایسا سخت جواب نہ دلواتا تو یہ اس کے فن کی زبردست خامی ہوتی۔ فردوسی نے یہاں حقیقت نگاری کو جذبات سے ہم آہنگ کرکے ایسے کردار کو اس کے حقیقی خدوخال میں پیش کیا ہے۔

محمود شیرانی نے بھی اس سلسلہ میں تقریباً انھیں خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں :-

"حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام معاملہ ابتدا ہی سے ایک قسم کی غلط فہمی تھی، جس کی نازک اور کمزور بنیاد پر الزامات کے عالی شان قصر تعمیر کر لئے گئے ہیں۔ فردوسی ایرانی شاعر تھا اور ایران مرحوم کی عظمت اور شکوہ کی افسانہ خوانی کر رہا تھا۔ کتاب جو اس کے پیشِ نظر تھی پہلوی تھی یا پہلوی ذرائع سے تدوین ہوئی تھی جس کا تمام نقطۂ نظر ایرانی بلکہ ساسانی تھا اور ہم یہ جانتے ہیں کہ جب قومی فخر و مباہات کا صنم کدہ تعمیر ہو رہا ہو تو دوسری قوموں کے کارناموں کی اس میں گنجائش نہیں ہوتی۔ جس حالت میں کہ رقابت کی آگ بھی زیرِ خاکستر ہو۔ فردوسی صنادیدِ عجم کی تاریخ لکھ رہا تھا۔ علاوہ بریں اس معاملہ میں اُس کی حیثیت ایک ترجمان سے زیادہ نہیں تھی۔ جو واقعات اس کو پہلوی ذرائع سے ملے وہی اُس نے نقل کر دیئے..... اگر جذباتِ عرب کے آئینہ پر سنگ باری کی گئی تو اُن کی ترجمانی میں فردوسی جس نے کہ ہم جان سکتے ہیں اُن کی شدت کے معتدل کرنے میں ایک حد تک جد و جہد بھی کی ہے۔ عقلاً و انصافاً چنداں ملزم نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔"[2]

---

[1] داستانِ عجم۔ مصنفہ نواب نصیر حسین خیال۔ صـ۷۷۔

[2] فردوسی پر چار مقالے (مقالہ سوم) مصنفہ محمود شیرانی۔ صـ۱۳۶۔ (اقتباس ذیلی حاشیہ سے)

فردوسی پر عرب دشمنی کا الزام (جسے اسلام دشمنی میں گنا جاتا ہے) صرف اس لئے لگانا کہ اُس نے شاہنامہ میں جا بجا اُن کی تحقیر کی ہے۔ کسی مؤرخ، تذکرہ نگار یا نقاد کو زیب نہیں دیتا۔ کیوں کہ ایسی حالت میں اس کے علاوہ بھی کوئی دوسرا قوم پرست شاعر ہوتا تو وہ بھی یہی کہتا۔

خاقانی تو ایران کی تاریخ بھی نہیں لکھ رہا تھا بلکہ مدائن کا قصیدہ لکھنے بیٹھا تھا لیکن وہ بھی اپنی عظمتِ دیرینہ کو اس طرح برباد دیکھ کر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور اس کی تباہی سے اس درجہ متاثر ہوا کہ اس کا قصیدہ اپنی اثر آفرینی کے لحاظ سے مرثیہ ہو گیا۔ جس کے مطلع کا مصرعۂ اُولیٰ درجِ ذیل ہے:-

ہاں اے دلِ عبرت بیں از دیدہ نظر کن ہاں

عام طور سے جتنے تذکرہ نگار اور مؤرخ ہیں انھوں نے فردوسی کے حُلیے پر کوئی خاص روشنی نہیں ڈالی ہے ہمیں اس کے بارے میں یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کس شکل و صورت کا تھا۔ لیکن آزاد ہمدانی نے ایک مقام پر اسکا مکمل نقشہ کھینچ دیا ہے۔ جس سے فردوسی کی ایک ہلکی سی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ مندرجہ ذیل عبارت میں اس کی جوانی کی تصویر پیش کی گئی ہے:-

"آن مرد کہ قامتی معتدل و چشماں سیاہ و جذاب و ابروان پیوستہ و ریش تنک کوتاہ و اندامی سیمیں و فربہ و سینہ کشادہ داشت" [1]

فردوسی کے لباس وغیرہ کے بارے میں بھی ہمیں آزاد ہمدانی ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس طرح کا لباس پہنا کرتا تھا۔ ہمدانی کی درجِ ذیل عبارت ملاحظہ ہو:-

"لباس ہائے فاخر بلندی در بر نمودہ و عمامہ کوچکے بر سر نہادہ و گیسوان سیاہ رنگ خود را بطرزِ اعراب در زیرِ عمامہ جا دادہ از طرزِ لباسش پیدا بود کہ از دہقانانِ محترم و ثروت مندِ این نواحی است۔" [2]

شاہنامہ کے مطالعہ اور فردوسی کے حالات کا جائزہ لینے سے یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ وہ عظیم شخصیت کا مالک تھا۔ ساتھ ہی ساتھ بلند حوصلہ بھی تھا اور عالی ظرف بھی۔ اتنا زیادہ بلند ہمت تھا کہ تکلیفیں اور مصائب،

---

[1] عشق و ادب۔ مصنفہ آزاد ہمدانی۔ ص۔ [2] ایضاً۔

شاہی ظلم وعتاب اور بدنصیبیاں نہایت صبر وتحمل سے برداشت کرلیتا تھا۔ اُسے اپنی قوم سے بہت محبت تھی، وہ اپنے ملک کو ماضی ہی کی طرح خوشحال دیکھنے کا متمنی تھا۔ اُسے روپیہ کی زیادہ فکر نہیں تھی اُس نے کبھی اپنے مربیوں کی دوسرے خوشامدی شعراء کی طرح غلو آمیز مدح نہیں کی، ان کی مدح وثنا میں زمین آسمان کے قلابے نہیں ملائے۔ اس کی وجہ شاید یہی ہے کہ "حرص وطمع کا سب سے بڑا دشمن ہم فردوسی ہی میں دیکھتے ہیں"[1]۔ اسی لئے اس نے مال ومتاع پر کبھی لالچی لوگوں کی طرح جان نہیں دی۔ اس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ جب محمود نے اس کو انعام کا روپیہ بھجوایا تھا تو اُس نے کھڑے کھڑے اُسے فقاعی وحمامی کو لٹا دیا تھا۔ فردوسی کی جگہ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو اُسی انعام کی رقم کو سینے سے لگاتا لیکن اس کے برخلاف فردوسی نے وہ سب لٹا دیا اور شاہی عتاب کا سزاوار ہوا۔

فردوسی میں عام انسانوں کی طرح جذبۂ انتقام بھی موجود تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب محمود نے حسب وعدہ شاہنامہ کا صلہ فی شعر ایک اشرفی کے حساب سے نہیں بھیجا تو اُس نے اپنی تقریباً پینتیس سال کی محنت کو رائگاں ہوتے دیکھ کر محمود کی زبردست ہجو لکھی۔ اور اُس نے زمانہ کی سرد مہریوں، ناہمواریوں کے درمیان خونِ جگر سے تیار کئے ہوئے شاہکار کی ناقدری کا محمود سے اتنا خطرناک انتقام لیا کہ محمود جیسا جابر بادشاہ بھی اُس کا کچھ بگاڑ نہ سکا۔

اُس نے انتقام لیا۔ محمود کی ہجو لکھی اور شاہی عتاب سے اپنے کو محفوظ رکھنے کے لئے غزنی سے اِدھر اُدھر پناہ لیتا پھرا لیکن معافی کا خواستگار نہیں ہوا۔ یہ تمام باتیں اس کے کردار کی مضبوطی وخودداری پر روشنی ڈالنے کے لئے کافی ہیں۔

جہاں تک اُس کی وفات کا تعلق ہے بیشتر تذکرے اس پر متفق ہیں کہ وہ ۴۱۱ھ میں واقع ہوئی تھی۔ علامہ شبلی دلائل سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ ۴۱۱ھ سے قبل ہی وفات پاگیا تھا۔ اس لئے کہ اُس نے شاہنامہ ۴۰۰ھ میں مکمل کیا تھا۔ جس کی تصریح خود فردوسی نے شاہنامہ کے اختتام پر کردی ہے۔ ؎

زہجرت شدہ پنج وہشتاد بار ٭ کہ گفتم من این نامۂ شہریار

شبلی نے مندرجہ ذیل شعر کا سہارا لے کر شاہنامہ کی تکمیل کے وقت فردوسی کی عمر کا تعین ۸۰ سال کیا ہے: ؎

کنوں عمر نزدیک ہشتاد شد ٭ امیدم بہ یکبارہ برباد شد

شبلی نے یہ بھی کہا ہے کہ فردوسی شاہنامہ کی تکمیل کے بعد دو چار برس سے زیادہ زندہ نہیں رہا۔ اس لئے اس کی وفات ۴۱۱ھ سے چند برس قبل ہی ہونا چاہیئے۔[2]

---

[1] فردوسی پر چار مقالے۔ از محمود شیرانی ص ۳۷ [2] شعر العجم (جلد اول) ص ۸۹ (مطبوعہ انوار المطابع لکھنؤ)

لیکن شبلی کے اتنے دلائل کے بعد بھی کوئی قطعی بات طے نہیں ہوتی۔ انھوں نے خود بھی اس سلسلہ میں کوئی دوٹوک فیصلہ نہیں دیا ہے۔ صرف "چند برس قبل" کی قید لگا کر خاموش ہو گئے ہیں۔ اس طرح چند برس کی توضیح کرنا اور کسی صحیح سنہ کا تعین کرنا مشکل کام ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود علامہ بھی اس سلسلہ میں کوئی قطعی رائے قائم نہیں کر پائے تھے۔

تاہم شبلی کی یہ بات مان لینے کو ضرور دل چاہتا ہے کہ فردوسی شاہنامہ کے اختتام کے بعد دو چار سال سے زیادہ حیات نہ رہا ہوگا۔ کیوں کہ قیاس یہ ہے کہ شاہنامہ کی تکمیل کے فوراً بعد ہی اُس نے اُسے محمود کے دربار میں پیش کیا تھا۔ جس کی محمود نے اتنی قدردانی نہیں کی (وجہ خواہ کچھ بھی رہی ہو) جس کی اُس سے توقع تھی۔ جس کے نتیجہ میں فردوسی نے اس کی ہجو لکھی اور مجبوراً غزنی کو خیرباد کہہ کر مختلف جگہوں پر قیام کرتا رہا۔[1] اور آخر میں طوس گیا۔ جہاں ایک روز بچوں کی زبان سے اپنی کہی ہوئی ہجو[2] کو سُن کر بہت متاثر ہوا اور پھر ایسا بیمار پڑا کہ دوبارہ اٹھنا نصیب نہ ہوا۔

ظاہر ہے غزنی سے روانہ ہونے کے بعد اُسے ہرات، مازندران اور بغداد کے قیام میں زیادہ سے زیادہ دو[2] تین[3] سال کا عرصہ ہی لگا ہوگا۔ کیوں کہ وہ اِن جگہوں پر زیادہ دنوں تک قیام نہ کر سکا تھا۔

پروفیسر ورما نے میتھو آرنلڈ کی "سہراب و رستم" پر دیباچہ لکھتے ہوئے فردوسی کے حالات کے ذیل میں فردوسی کی تاریخِ وفات عام تذکروں کے مطابق ۴۱۱ھ ہی بتائی ہے اور ولادت کی تاریخ ۳۲۹ھ۔ اس طرح سنہ وفات اور سنہ ولادت کی تفریق سے فردوسی کی عمر ۸۲ سال نکلتی ہے۔ اس کے برخلاف پروفیسر ورما نے[3] جو سنہ عیسوی تحریر کئے ہیں تو اُن سے کئی سال کا فرق نکل آتا ہے۔ مثلاً تاریخِ ولادت ۹۴۱ء اور وفات ۱۰۲۰ء بتائی ہے، اس حساب سے اُس کی عمر ۷۹ سال نکلتی ہے جو قیاساً غلط معلوم ہوتی ہے۔

اگر فردوسی کی تاریخِ وفات ۴۱۱ھ مان لی جائے اور شاہنامہ کے اختتام کے وقت اس کی عمر اسّی سال اور یہ بھی مان لیا جائے کہ وہ شاہنامہ کی تکمیل کے بعد دو[2] سال سے زیادہ حیات نہیں رہا تو اس طرح اس کی سنہ ولادت ۳۲۹ھ نکل آئے گی جو یقیناً دوسری سنین کے مقابلے میں زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے ——!!

---

[1] فردوسی کے اس طویل سفر کے بارے میں محمود شیرانی نے سب سے زیادہ اختلاف ظاہر کیا ہے۔ جس کا اظہار انھوں نے اپنی کتاب "فردوسی پر چار مقالے" کے مقالہ بعنوان "ہجو سلطانِ محمود اور فردوسی" میں کیا ہے۔ انھوں نے اس ہجو کو فردوسی کی تخلیق ہی ماننے سے انکار کیا ہے، اور اسے الحاقی قرار دیا ہے۔ انھوں نے اس سے بھی انکار کیا ہے کہ فردوسی نے اتنے بڑھاپے میں اتنا طویل سفر کیا ہوگا۔

[2] ہجو محمود۔ [3] MATHEW ARNALD'S -- SOHRAB AND RUSTUM, BY PROF. U.S.VARMA PRINTED AT RAMESH PUBLIS HING HOUSE ALLAHABAD, 1946 PAGE XIV XX,